مغربی ناول کے اردو تراجم اور پڑھت کے مسائل: تحقیق و تجزیہ

Translations of Western Novels in Urdu and Problems of Reading.

ڈاکٹر ظہیر عباس

اسسٹنٹ پروفیسر ادارہ زبان و ادبیات اردو،
پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Translating fiction from one language to other is a difficult process. It becomes more taxing to read and understand some substandard translations. In this article it has been analyzed that why one confronts the difficulty to understand the novel truly after translation, how meanings are transformed with slightest changing in the words and in which way seasoned translators skillfully convert the creative essence of original language in their own language. In the end some suggestion are made for improvements in Urdu translations.

کلیدی الفاظ۔ آصف فرخی، احمد مشتاق، بنجر میدان، عمر میمن، حس عسکری، محمد سلیم الرحمان

مغربی فکشن اور اس کے اردو تراجم کا ادنی قاری ہونے کے ناطے مجھے بھی وہی مسایل در پیش رہتے ہیں، جن سے دوسرے قارئین نبرد آزما ہوتے ہیں۔ فکشن کے تراجم کا حال اردو فکشن سے زیادہ مختلف نہیں ہے، بعض باکمال اور اکثر اذیت میں مبتلا کر دینے والے۔ یہاں فکشن کا وہ قاری موضوع بحث نہیں ہے جس کا مقصد محض کہانی سے لطف اندوز ہونا ہے۔ ایسا قاری روز مرہ کی سخت کوش ذمہ داریوں سے نبرد آزمائی کے بعد جب سونے کو لیٹتا ہے تو کوئی ہلکی پھلکی کہانیوں کی کتاب، کوئی ڈائجسٹ اٹھالیتا ہے۔ یہ کہانیاں تیسرے درجے کی مقبول کہانیاں ہوتی ہیں۔ کہانی اسے لوری دیتی ہوئی نیند کی وادیوں میں لے جاتی ہے۔ یوں وہ صبح تازہ دم اٹھتا ہے رات والی کہانی اس کے دماغ سے محو ہو چکی ہوتی ہے۔ کہانی یاد رکھنا، اس پر غور و فکر کرنا اس کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ وہ تو بس کچھ لمحوں کے لیے ذہنی تناؤ دور کرنے کو کتاب کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ لکھے ہوئے الفاظ بسا اوقات جیتے جاگتے انسانوں کے منہ سے نکلے ہوئے شیریں جملوں سے زیادہ اثر پذیری رکھتے ہیں۔ مقبول عام ادب کا لکھاری اور قاری دونوں کا تعلق ایک ہی قبیلے سے ہوتا ہے۔ لکھنے والا قارئین کی ذہنی استعداد کو مد نظر رکھ کر لکھتا ہے اور

مطلوبہ نتائج حاصل کرتا ہے۔روز افزوں زندگی کی سامنے کی باتیں دلچسپ پیرائے میں بیان کر دی جاتی ہیں۔پراگندہ حال شخص کا ذہنی تناؤ کم کرنے میں یہ کہانیاں نسخہ اکسیر کا کردار ادا کرتی ہیں۔ایسی کہانیاں قاری کی یاد میں بسا اوقات محفوظ رہ جاتی ہیں لیکن اکثر بھول بھال جاتی ہیں۔

اس کے مقابلے میں ادب کا وہ قاری جس کا جینا مرنا مقبول عام ادب کے بجائے عظیم ادب کے ساتھ ہو،اس کا مسئلہ محض کہانی نہیں ہوتا۔کہانی اس کی یادداشت کے ساتھ کھلواڑ کرتی ہے۔اس کی یادداشت سے چپک جاتی ہے۔کہانی بھول جانا اس کے اختیار میں نہیں ہوتا۔کہانی جتنی تگڑی ہوگی وہ اسے اتنا ہی زیادہ یاد رہے گی اور گاہے گاہے اسے اپنی طرف بلاتی بھی رہے گی۔بے شمار کہانیاں ہم بار بار پڑھتے ہیں اور ہر بار ایک نئے ذائقے سے روشناس ہوتے ہیں۔اس ذائقے کا تعلق محض کہانی سے نہیں ہوتا بلکہ اس طریقہ کار کے ساتھ ہوتا ہے جو ایک مصنف کہانی لکھتے ہوئے استعمال کرتا ہے۔یہ مخصوص طریقہ کار ہی ایک مصنف کو دوسرے سے ممتاز کرتا ہے۔ورنہ کہانیاں تو صدیوں سے ایک جیسی ہی ہیں۔کہانی کے ترجمے کا حال بھی کہانی جیسا ہی ہے۔بڑا مترجم کہانی کے ساتھ اس طریقہ کار کو بھی کسی حد تک دوسری زبان میں منتقل کر دیتا ہے۔ترجمہ محض لغت کی انگلی پکڑ کر ایک لفظ کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام نہیں ہے۔اگر ایسا ہوتا تو ہم اچھے اور برے ترجمے میں تمیز کرنے سے قاصر ہوتے۔بڑا مترجم شفاف آئینے جیسا متبادل لفظ ڈھونڈ کر لاتا ہے جس کی اوٹ سے دوسری تہذیب جیتی جاگتی نظر آتی ہے۔

ہمارے یہاں اچھی ترجمہ نگاری کا روز اول سے فقدان رہا ہے۔اگر فکشن کے اچھے تراجم کی بات کی جائے تو ان کے نام ایک ہی سانس میں گنوائے جاسکتے ہیں جبکہ دنیا کی دوسری زبانوں میں ایک ہی ناول کے کئی کئی تراجم موجود ہیں۔ہر بڑا ناول اپنے اندر تفہیم کے لامحدود امکانات رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس پر ہر عہد میں کئی حوالوں سے لکھا جاتا ہے۔ایسے ہی بڑے ناول کے اندر کئی بار ترجمہ کرنے کے امکانات بھی ہوتے ہیں۔ایسا نہیں ہوتا کہ بعد میں ترجمہ کرنے والا پہلے ترجمے کو کمتر خیال کرتا ہے جیسا ہمارے ہاں عموماً ہوتا ہے۔بقول محمد عمر میمن:

> ”مغربی ادیب کی نگارش کو متعدد ترجموں کی حاجت اس لیے پیش آتی ہے کہ ہر پچھلا ترجمہ صحیح نہیں تھا،معاملے کی پیچیدگی کو کچھ زیادہ ہی آسان بنا دیتا ہے۔ہمیں یہ فرض نہیں کر لینا چاہیے کہ متن کوئی اٹل اور جامد شے ہے جس کے بس ایک معنی ہوتے ہیں۔چونکہ ہر معاشرہ اور نسل کسی فن پارے کا ترجمہ اولاً اپنے لیے کرتی ہے،اس کے مختلف ترجموں میں فرق اور اختلاف کا در آنا ناگزیر ہے۔پھر یہ کہ ہر نسل کے ترجمہ نگار فن پارے کی تفہیم میں اپنی مخصوص شخصیت اور بصیرت سے کام لیتے ہیں جن کا واحد ترجمے کی صورت میں ضائع ہو جانا لازم ہے۔(1)

مغربی ادیب کی نگارش کو متعدد ترجموں کی حاجت بھی مغرب ہی میں آتی ہے۔ ان مختلف تراجم میں فرق اور اختلاف کا تعلق بھی مغربی تراجم کے ساتھ ہی ہے۔ فٹز جیرالڈ کے عمر خیام کی رباعیات کے ترجمہ کا موازنہ رابرٹ گریوز کے ترجمے کے ساتھ ہی چچتا ہے۔ مادام بواری کے انگریزی مترجمین، الین رسل، مارگریٹ مالڈون اور جیوفری وال کے تراجم اپنی اپنی نسل اور معاشرے کی خفیف فرق کے ساتھ تفہیم کا در وا ضرور کرتے ہوں گے۔ ہمارے یہاں ایسی کوئی صورت نہیں ہے۔ یہاں ہم چند ایک مثالوں سے بات واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً میلان کنڈیرا کے ناول Identity کے اردو میں دو ترجم ہو چکے ہیں۔ ایک محمد عمر میمن نے 'پہچان' کے نام سے کیا ہے اور دوسرا ترجمہ 'شناخت' کے نام سے نیر زیدی نے کیا۔ فرق صاف ظاہر ہے۔ ادب کا وہ قاری جس کی نظر سے نیر زیدی والا ترجمہ ہی گزرا ہے اس کی کنڈیرا کے بارے میں رائے کچھ اور ہو گی۔ جس نے میمن والا ترجمہ پڑھ رکھا ہے اس کے نزدیک کنڈیرا اور درجے کا مصنف ٹھہرے گا۔ یہاں اختلاف برابری کی سطح پر نہیں ہو گا۔ ایک ترجمہ برا ہے اور دوسرا بہترین۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ شاعری کا ترجمہ فکشن کے مقابلے میں بہت مشکل ہے ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اگر یہ اتنا ہی آسان کام ہوتا تو فکشن کا ہر ترجمہ اعلیٰ درجے کا ہوتا۔

شاہد حمید صاحب اور فیصل اعوان کے 'جنگ اور امن' کے تراجم کا بھی اس نقطہ نظر سے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ فیصل اعوان کا ترجمہ بہت برا ہے اتنے ضخیم ناول کو ہاتھ ڈالنے کے لیے بہت حوصلہ چاہیے۔ ٹالسٹائی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ عالمی فکشن میں منظر نگاری کے حوالے سے اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ 'جنگ اور امن' میں نجی محفلوں میں کی گئی متوازی اور ایک دوسرے کو قطع کرتی ہوئی گفتگوؤں کا خلاق بیانیہ اپنی مثال آپ ہے۔ ایسی صورت حال کا کسی بھی نوزائیدہ زبان میں ترجمہ بے پناہ ریاضت کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ کام ہمارے شاہد حمید نے کر دکھایا۔ فیصل اعوان کے ترجمہ میں یہ بات جابجا کھٹکتی ہے۔ اس ترجمے میں اس بصیرت کا فقدان ہے جس کی ضرورت شاہد حمید کے بعد ترجمہ کرنے والے کو مطلوب تھی۔

'تنہائی کے سو سال' کی عالمی شہرت اور اثر پذیری سے کون واقف نہیں۔ ہمارے ہاں اردو میں جس ترجمے کی شہرت ہے اس کے مترجم نعیم کلاسرا ہیں۔ ترجمہ برا نہیں ہے لیکن اعلیٰ بھی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ زینت حسام نے بھی اس کے پہلے تین ابواب کا ترجمہ کیا ہے جو کلاسرا کے ترجمے سے بدرجہا بہتر ہے لیکن افسوس ان کا یہ ترجمہ تین ابواب سے آگے نہ بڑھ سکا۔ یہاں ناول کے آغاز سے دونوں تراجم کا ایک ایک پراگراف نقل کر رہا ہوں۔

''بہت برسوں بعد، فائرنگ اسکواڈ کا سامنا کرتے ہوئے، کرنل ارلیانو بوئندیا ماضی کی اس دور دراز سہ پہر کو یاد کرنے والا تھا جب اس کا باپ زندگی میں پہلی بار اسے برف دکھانے لے گیا تھا۔ اس وقت ماکوندو مٹی کے بیس گھروں پر مشتمل گاؤں

تھا، جو ایک ایسے دریا کے کنارے بنائے گئے تھے جس کا شفاف پانی چکنے پتھروں کے پاٹ پر بہتا تھا۔ یہ پتھر ما قبل تاریخ کے انڈوں کی مانند سفید اور عظیم الجثہ تھے۔ دنیا اتنی تازہ تھی کہ چیزوں کے کوئی نام نہ تھے، اور ان کا ذکر کرتے وقت ان کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہوتا۔ ''مترجم زینت حسام،(2)

'' برسوں بعد، فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑے کرنل ارلیانو بوئندا کے ذہن میں بھولی بسری وہ سہ پہر تھی۔ جب زندگی میں پہلی مرتبہ اس کا باپ اسے برف دکھانے لے گیا تھا۔ اس زمانے میں دریا کے کنارے بیس گھروں کی بستی ماکوندو آباد تھی۔ شفاف پانی چمکدار پتھروں کے پاٹ پر بہتا تھا۔ بے شمار سفید پتھر قدیم دور کے انڈوں کی طرح لگتے تھے۔ ماحول ارتقائی مراحل میں تھا۔ بہت سی چیزیں بے نام تھیں اور ان کی نشاندہی کے لیے اشارہ کرنا ضروری تھا۔ ''نعیم کلاسرا،(3)

جملوں کی تفریق ملاحظہ فرمائیں: 'فائرنگ اسکواڈ کا سامنا کرتے ہوئے' میں جبر جبکہ 'فائرنگ سکواڈ کے سامنے کھڑے' ہونے میں اختیار اور رضامندی کا گمان ہوتا ہے۔ ماضی کی دور دراز سہ پہر سے مراد وہ سہ پہر ہے جس کا تعلق ماضی بعید یعنی بچپن سے ہے لیکن کردار کے دماغ میں روشن ہے جبکہ بھولی بسری سہ پہر کا مطلب بہت مبہم ہے، اس وقت ماکوندو مٹی کے بیس گھروں پر مشتمل گاؤں تھا یعنی بعد میں ماکوندو میں اور گھروں کا اضافہ ہوا، آبادی اور کردار بڑھ گئے۔ خود ناول کا متن بھی اس کی گواہی دیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں 'اس زمانے میں دریا کے کنارے بیس گھروں کی بستی ماکوندو آباد تھی' سے یوں محسوس جیسے وہ بستی وقت کے ساتھ نابود ہو گئی ہو۔ جملے میں وہ مطلوبہ تحرک نہیں ہے۔ چکنے پتھروں کا تعلق ہی ندی کے ساتھ ہے اور چمکدار پتھر تو عام پتھر بھی ہو سکتے ہیں، 'دنیا اتنی تازہ تھی' چار لفظوں مشتمل جملے میں کتنی تازگی ہے جبکہ ارتقائی مراحل سے یوں لگتا ہے جیسے ہم کوئی تنقیدی مضمون شروع کرنے جا رہے ہیں، 'ما قبل تاریخ' سے مراد وہ دنیا ہے جو تاریخ کی لکیر سے پیچھے ہے جبکہ قدیم دور تو مابعد تاریخ کا دور بھی ہو سکتا ہے۔ اس دور کے مسایل اور ما قبل تاریخ مسایل میں زمیں آسمان کا فرق ہے۔ اس مختصر پیراگراف میں ترجمے کے کئی مسایل در آئے ہیں۔ دونوں ترجموں میں تضاد تھوڑا مزید غور کرنے اور عیاں ہو سکتا ہے۔ ذرا غور فرمائیں اگر یوں مکمل ناولوں کے تراجم کا موازنہ کیا جائے تو کسی مضحکہ خیز صورت ہو۔ یہاں میں قدرے بہتر تراجم کا موازنہ کیا ہے ان تراجم کو اگر انگریزی متن کے سامنے رکھ کر دیکھیں تو اس زیادہ دلچسپ صورت ہو سکتی ہے۔ فکشن کا زیرک قاری ان جملوں کی بظاہر خفیف لیکن بنیادی تفریق سے بخوبی آگاہ ہے۔ بڑے مترجم کے پاس بھی لفظوں کا وہی ذخیرہ ہوتا ہے فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ باخبر ہوتا ہے۔ یہ بات جانتا ہے کہ کس لفظ سے کب، کہاں اور کیا کام لینا۔ نعیم کلاسرا کے مقابلے میں زینت حسام کا ترجمہ متن کے زیادہ قریب اور بامعنی معلوم ہوتا ہے۔

'وبا کے دنوں میں محبت' مارکیز کا دوسرا شاہکار ناول ہے جس کے مترجم ارشد وحید ہیں۔ ہمارے ہاں انہیں کے ترجمے کو شہرت ملی۔ ان کے علاوہ اجمل کمال نے بھی 'وبا کے دنوں میں محبت کے دوسرے باب کا ترجمہ کیا ان دونوں کے موازنہ کی بھی یہی صورت ہے۔ اگر اجمل کمال اس ناول کا مکمل ترجمہ کر دیتے تو یہ اردو ادب پر بہت بڑا احسان ہوتا۔ مارکیز کا وہ کام جو آج کی منتخب تحریں کے نام سے ترجمہ ہوا ان کا مزاج باقی ترجم سے بالکل مختلف ہے ۔اس وجہ یہی ہے کہ یہ لوگ عالمی ادب کے بڑے قارئین ہیں۔ باقی لوگوں کی تربیت اور طرح کی ہے۔ میرے جیسے ترجمہ کے قاری کی نزدیک مارکیز کا اردو میں صحیح تعارف اجمل کمال کا انتخاب ہے۔ اردو میں مارکیز ناولوں میں سے بہترین افضال احمد سید کے قلم سے 'ایک پیش گفتہ موت کی روداد' کے نام سے ہوا۔ یہی صورت دوسرے مصنفین کی ہے۔ ادب کا قاری جب تک اچھے اور کمتر درجے کے تراجم سے کا موازنہ کرنے کے اہل نہیں ہو گا تب تک وہ مصنف کی تخلیقی اپروچ سے واقفیت حاصل نہیں کر پائے۔ اس کے لیے خود مقامی زبان کے تمام فکشن سے واقفیت بھی لازم ہے۔ دوسری صورت میں وہ اچھے اور برے قارئین میں تقسیم ہو کر رہ جائے گا۔

اوپر ہم نے مارکیز کے دو تراجم کا موازنہ پیش کیا ہے۔ مقصد اچھے، برے ترجمے کی تفریق کے ساتھ قارئین کو یہ باور کرانا تھا کہ کس طرح تراجم بسا اوقات گمراہ کن ہو سکتے ہیں۔ اب ہم اردو کے دو بہترین تراجم کا انگریزی متن سے موازنہ کر کے دیکھتے ہیں۔ شاندور مارئی ہنگری زبان کے بہت باکمال ناول نگار ہیں۔ تیس کی دہائی میں لکھنے والا یہ بے مثال ناول نگار اس حوالے سے بد قسمت رہا کہ اس کے ناول انگریزی میں اس کی موت کے بعد ترجمہ ہوئے۔ اگر یہ ناول کہیں پہلے ترجمہ ہو چکے ہوتے تو عالمی ناول پر بہت گہرے اثرات مرتب کرتے۔ خیر اب اگر یہ سلسلہ چل نکلا ہے تو مارئی کے ناول بھی عالمی ناول کی کہکشاں میں اپنی دمک چھوڑے بغیر نہیں رہیں گے۔ اس کا شاہکار ناول ''انگارے'' پہلی مرتبہ ۲۰۰۱ میں انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ یہ اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ محمد عمر میمن جیسے منجھے ہوئے مترجم نے اردو قارئین کے لیے نہ صرف اس ناول کو اردو کے قالب میں ڈھالا بلکہ اس کے ایک اور ناول کا بھی لگے ہاتھوں ترجمہ کر ڈالا جو ''ایستھر کا ورثہ'' کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ ''انگارے'' کے ترجمے کی مشکلات کے حوالے سے ان کا یہ استدال بہت تنگڑا ہے۔ ''اس ناول کا اردو ترجمہ، جو آپ اب پڑھنے والے ہیں، میں نے ستم بالائے ستم، جین وے کے انگریزی ترجمے سے کیا ہے۔ اس طویل سفر میں (ہنگرین ، جرمن، انگریزی، اردو) جانے کیا کچھ بچھڑ گیا ہو گا۔''(4) مترجم کی مشکل اور کم مائیگی کا اعتراف اپنی جگہ قابل احترام ہیں۔ ہمارے یہاں کتنے مترجم ہیں جو ترجمے کو کٹھن کار گزاری سمجھتے ہیں؟ بڑا مترجم نہ صرف خود حظ اٹھاتا ہے بلکہ لطف کے ساتھ ساتھ وہ قاری کو یہ احساس بھی دلاتا ہے کہ یہ فن پارہ جو آپ کے ہاتھوں میں اسے

بہترین بنانے میں اسے کیسے خون پسینا ایک کرنا پڑا ہے۔ مذکورہ ناول کے گیارہویں باب سے ایک پیرا گراف ملاحظہ ہو!

> ”پور سلین کے شمع دانوں کی ایک پوری قطار میز کے طول کے ساتھ ساتھ کھڑی ہے، جن میں موٹی موٹی نیلے مذہبی رنگ کی موم بتیاں ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری واحد روشنی کمرے کے چاروں کونوں میں مخفی نقطوں سے آرہی ہے۔ ماحول کی نیم تاریکی میں موم بتیاں اونچی لو سے تھرتھراتی روشنی کے ساتھ جل رہی ہیں۔ سرمئی سنگ مرمر کے آتش دان میں لکڑی کے لٹھوں سے روشنی کا مدھم سا غبار اٹھ رہا ہے۔ فرانسیسی طرز کے دروازے خفیف سے وا ہیں، سرمئی ریشم کے پردے پوری طرح بند نہیں، اور گاہے گاہے شام کی ہواؤں کے جھونکے کھڑکیوں سے اندر چلے آتے ہیں، اور مہین پردوں سے چاندنی میں نہایا ہوا منظر اور فاصلے میں شہر کی جھلملاتی روشنیاں عیاں ہو جاتی ہیں۔“(5)

تھرتھراتی روشنی، ’مدھم غبار‘، ’خفیف‘، سرمئی ریشم‘، ’مہین پردے‘، جھلملاتی روشنیوں کا عیاں ہونا۔ سارا ماحول متحرک اور زندگی سے بھرپور ہے۔ دو کردار (ہینرک اور کونرڈ) کئی سال پہلے گزرے ہوئے واقعات پر محو گفتگو ہیں۔ لمحہ موجود میں ہیں لیکن شہر سے ذرا فاصلے پر موجود ایک پرشکوہ محل کے ایک کمرے میں بیٹھے ہیں۔ یادوں کے بہاؤ میں تیرتے پھرتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے ماضی کی بھول بھلیوں سے ہانپتے ہوئے نکلتے ہیں تو ارد گرد نظر ڈالتے ہیں۔ یہاں بیانیہ اپنے ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ عمر میمن صاحب کی اس ساری صورت حال پر بطور زیرک قاری کے نہ صرف گہری نظر ہے بلکہ وہ بطور مترجم اپنی زبان سے ایسے ایسے متبادلات ڈھونڈ کر لاتا ہے کہ قاری عش عش کر اٹھتا ہے۔ ناول کا پورا کمال ترجمے میں در آیا ہے۔ یہ جو جیتی جاگتی فضا ہے یہ اصلی ناول کا کمال نہیں ہے بلکہ یہ ترجمے کا سحر ہے جس میں ہر تربیت یافتہ قاری گرفتار ہو جاتا ہے۔ وہ جو اردو کو نوزائیدہ زبان کہہ کے لمبی تان کے سو جاتے ہیں۔ انہیں یہ ترجمہ لازمی پڑھنا چاہیے۔

میلان کنڈیرا عہد جدید کا بہت اہم حوالہ ہے۔ وہ ناول صرف ایک پر اثر ناول نگار ہے بلکہ ناول کے فن پر بھی اس کی بہت گہری نظر ہے۔ ناول پر اس کے مضامین، کنڈیرا کی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اردو دنیا کے ساتھ اس بے مثال ادیب کا تعارف بھی عمر میمن صاحب کے ذریعے سے ہی ہوا۔ کنڈیرا ایک پیچیدہ لکھاری ہے۔ اس کے کام کو دوسری زبان میں منتقل کرنا کسی سادہ لوح کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اس کے ناول کہانی سیدھی کھنچی ہوئی لکیر پر نہیں چلتے۔ وہ تاریخ، فلسفہ اور فرضی کہانی کی حد بندیوں کو توڑ دیتا ہے۔ یوں اس کے فکشن کے ترجمہ کے لیے بھی ناول کی اس روایت سے واقفیت ضروری ہے جس کے زیر اثر وہ ناول لکھتا ہے۔ یہاں کنڈیرا کے معروف ناول ”خندہ اور فراموشی کی کتاب“ کے ایک پیرا گراف کا ترجمہ دیکھیے اور سر دھنیے!

"اسے محسوس ہوا کہ وہ جست جو اس نے ابھی ابھی لگائی تھی، غیر مختتم وقت کے دوسرے کنارے پر لگائی گئی تھی، ایک کودک کی زقند جو لڑکپن سے بلوغت کا راستہ لڑھکتے پڑھکتے طے کر رہا ہو۔ اور جب وہ اس کے جسم میں آگے پیچھے ہونے لگا، ہر بار اسے محسوس ہوا کہ وہ وقت میں آگے پیچھے آ جا رہا ہے، جیسے وہ طفولیت سے بلوغت اور پھر واپس طفولت کی طرف حرکت کا خاکہ کھینچ رہا ہو، وہ حرکت جو بہت بڑے نسوانی جسم کو بے بسی سے گھورتے ہوئے بچے سے شروع ہو کر اس آدمی تک جا رہی ہو جو اس کے جسم کو گرفت میں لیے ہوئے ہو اور اسے سدھا رہا ہو۔ وہ حرکت جو ناپ میں عام طور پر چھ انچ سے زیادہ لمبی نہیں ہوتی ہے، اتنی ہی طویل تھی جتنی تین دہائیاں۔(6)

جملوں کی حسن ترتیب پہ ذرا غور کریں۔ اردو زبان کی کم مائیگی اپنی جگہ لیکن طویل جملوں کی یوں با معنی توڑ پھوڑ اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ مترجم کو زبان کے تخلیقی عنصر کو دوسری زبان میں انتقال پر کتنی قدرت حاصل ہے۔ پورے ناول میں انہوں نے اردو کی تراکیب اور الفاظ کا یوں چناؤ کیا ہے کہ قاری کے دماغ میں کوئی متبادل جملہ یا لفظ تک نہیں آتا۔ اگر ہم اردو متن کو انگریزی کے شانہ بشانہ رکھ کر دیکھیں تو خوشگوار حیرت کا احساس ہوتا ہے۔ یہی گمان ہوتا ہے کہ ترجمہ اصل سے بڑھ کے ہے۔ وجہ یہی ہے کہ مترجم نرا مترجم نہیں ہے بلکہ عالمی فکشن کا دہایوں سے قاری ہے۔ وہ تخلیقی اور غیر تخلیقی زبان کی تفریق سے بخوبی آگاہ ہے۔

ترجمہ کی روایت کا جب بھی ذکر ہو گا محمد سلیم الرحمان صاحب کا نام بڑے احترام سے لیا جائے گا۔ یوں تو ان کے کریڈٹ پر کئی تراجم ہیں لیکن جوزف کونرڈ کے ناول 'Heart of Darkness' کا ترجمہ، اردو تراجم کی دنیا میں کسی معجزے سے کم نہیں۔ 'قلب ظلمات' بیسویں صدی کے چند بے مثال ناولوں میں سے ایک ہے۔ یہ ناول، نیم وحشی افریقیوں کی سرزمین پر نو آبادکاروں کی جائز اور منطقی مداخلت اور مقامیوں کے لایعنی اور غیر فعال رد عمل کا، ایسا تخلیقی بیانیہ ہے، اکیسویں صدی میں جس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ مختصر اور گنجان ناول قاری پر بھول بھلیوں کی حکمت کے ممکنہ رموز آشکار کر دیتا ہے۔ ایسے ناولوں کے تراجم کے لیے زبان دانی کے ساتھ درجہ کمال کو پہنچی ہوئی اس مخصوص دانش کو بھی بروئے کار لانا پڑتا ہے جس کا تعلق فقط فکشن کی تفہیم اور سوجھ بوجھ کے ساتھ ہے۔ ناول کے آغاز سے ایک پیراگراف دیکھئے اور خود فیصلہ کیجیے:

"دریائے ٹیمز کی سمندر کے قریب پہنائی ہمارے روبرو کسی لامتناہی آب راہ کے مانند پھیلی ہوئی تھی۔ ساحل سے پرے سمندر اور آسمان کسی جوڑ کے بغیر پیوست تھے اور روشن وسعت میں مد کے ساتھ بہہ کر آنے والی کشتیوں کی ترچھی بادبانی بلیوں پر وارنش کی چمک تھی۔ ان کے خاص طرح کے کلف لگے اکڑے اکڑے بادبان، سیدھے تنے کرمچ کے سرخ سرخ گچھوں کی شکل میں ساکت کھڑے معلوم ہو رہے تھے۔ پست کناروں پر دھند ٹکی ہوئی، جن کا اوجھل ہوتا سپاٹ پن

سمندر کی طرف دور تک گسترده۔ گریوزینڈ کے اوپر فضا تیرہ و تار تھی اور مزید پرے کثیف تر ہو کر ماتمی اندھیرے سے مشابہ معلوم ہوتی تھی جو دنیا کے سب سے بڑے اور بزرگ ترین شہر پر بے حس و حرکت مسلط تھا۔(7)

بڑا مترجم اپنی زبان کے ادیبوں کو ترجمے کی وساطت سے اچھا لکھنے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ ترجمہ کی گئی تحریر کا مواد اگرچہ اپنی اصل تہذیب کا نمایندہ ہوتا ہے لیکن ترجمے کے بعد وہ ترجمہ ہونے والی زبان کا سرمایہ بن جاتا ہے۔ ترجمے کی عمر کا انحصار اس کے اعلیٰ وادنیٰ ہونے پر ہوتا ہے۔ ہمارے کتنے ہی دوسرے درجے کے لکھنے والے وقت کی گرد میں گم ہو گئے لیکن اچھے ترجمے بار بار چھپ رہے ہیں ان کی مقبولیت میں کسی صورت کمی نہیں آرہی۔ مقامی زبان کے فکشن کو موضوعاتی اور ہیتی حوالوں سے ترجمہ ہی مالا مال کرتا ہے۔ حیران کن طور پر اردو فکشن کے باب میں ایسا نہیں ہوا۔ ہمارے قارئین کا ایک طبقہ اچھے اور برے ترجمے کی تفریق کرنے سے قاصر ہے۔ ایک بڑا گروہ ایسا بھی ہے جو شاعری کے مقابلے میں فکشن کو کمتر تصور کرتا ہے۔ بعض کے نزدیک ناول ایک طویل کہانی کے سوا کچھ نہیں تو کچھ کا خیال ہے کہ کہانی وہ جو آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ اس کی ایک سب سے بڑی وجہ ہمارے ہاں کا حقیقت پسند روایت کا سیدھی لکیر میں چلتا ہوا ناول ہے جس کے پیچھے ہماری لوک کہانی اور داستان اب بھی پوری شدت سے موجود ہے۔ ہم ابھی تک اس مغالطے سے جان نہیں چھڑا سکے کہ ناول داستان کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ انیسویں صدی میں مرتب کیے گئے قصے کہانیاں اور داستانیں بلاشبہ ہماری ادبی روایت کا روشن باب ہیں۔ داستان امیر حمزہ کی نثر کی بے بہا قوت اپنی مثال آپ ہے۔ سرشار کے ناولوں کی زبان ،ناولوں کی کہانی سے الگ اپنی انفرادی شناخت رکھتی ہے۔ ہمارے کلاسیکی مزاج کے حامل قاری ناول کی اصل سے جدا، اس مخصوص شاعرانہ نثر کے بجا طور پر شیدائی ہیں۔

ہمارے ہاں اس طرح کی صورت حال نے مختلف سطح کے قارئین پیدا کیے۔ قارئین کے ان دائروں میں تقسیم ہو جانے کی وجہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ ادبی قارئین کا ایک بہت بڑا حلقہ رواں اور سلیس نثر کا دلدادہ ہے۔ ناصر نذیر فراق، اشرف صبوحی، محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر جیسے نثاروں کی خلاقی سے کسے انکار ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے تخلیقی مرتبے سے قطع نظر، ان کے اک اک جملے پر جان نچھاور کرنے والے اس وقت تک موجود رہیں گے جب تک زبان زندہ ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ فکشن کی زبان بسا اوقات روایتی سلاست اور روانی کے دائروں میں نہیں آتی۔ اس حوالے سے محمد حسن عسکری کا موبی ڈک کا ترجمہ میرے ذہن میں آرہا ہے۔ ذاتی پسند سے قطعہ نظر اردو کے بعض قارئین اس کی صحافیانہ تفاصیل سے لطف اندوز نہیں ہو پاتے۔ کچھ ان تفاصیل کو غیر ضروری اور کچھ خشک تصور کرتے ہیں۔ ہماری تربیت جس نثر نے کی وہ تو رواں، سلیس اور چست ہے۔ ہمارا قاری جب اپنی دہلوی نثر سے اس کا موازنہ کرتا ہے تو سخت مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے بلکہ وہ دہلوی نثر کے علاوہ باقیوں کا اردو دانوں میں شمار ہی نہیں کرتا۔ لیکن عالمی فکشن کا سوجھ بوجھ رکھنے والا قاری ان تفاصیل

کو ٹاٹ باہر نہیں کر سکتا۔ اگر ناول میں یہ صحافیانہ تفاصیل نہ ہوتیں تو ناول شاہکار بن ہی نہیں سکتا تھا۔ ناول نگار سمندر کی اتھاہ گہرائی سے قاری کو بغیر مقصد کے بار بار باہر کیوں نکالتا ہے؟ در حقیقت یہ اس طویل اور کٹھن سفر کے درمیانی پڑاؤ ہیں۔ ناول کی ہیت میں ان کی کلیدی حیثیت ہے۔ اردو فکشن سے ٹکڑوں میں حظ اٹھانے والا قاری یہ سہار نہیں پاتا۔ محمد حسن عسکری ایسے قاری پر جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ اردو کے تراجم میں مادام بواری کا ترجمہ اپنا ایک علیحدہ مقام رکھتا ہے۔ ترجمے کی مشکلات اور قارئین کی توقعات سے تنگ آ کر کہتے ہیں۔ ''فلوبیر نے بار بار مختلف قسم کے خیالات کو تقابل یا تضاد کے لیے ایک ہی جملے میں بند کیا ہے۔ میں نے ایسے جملوں کا مطلب لکھنے کی بجائے انہیں ویسے کے ویسے ہی اردو میں منتقل کر دیا اردو والوں نے شکایت کہ روانی اور سلاست نہیں ہے۔''(۸) یہ روانی اور سلاست کے مباحث کا تعلق خالصتا اردو نثر کے ساتھ ہے۔

مغربی فکشن کا معاملہ اور ہے یہاں ہر ناول کی قرات نئے انداز سے ہو گی۔ ایک ہی مصنف کے دو ناولوں پر مختلف مصنفین کا دھوکہ ہو سکتا ہے۔ اس کی بہترین مثال فلوبیر کے مادام بواری (مترجم محمد حسن عسکری) اور سلامبو (عنایت اللہ دہلوی) ہیں۔ دونوں ناولوں کے تراجم جب خلاق مترجم کے قلم سے نکلے تو بات بنی۔ ایسے ناولوں کے تراجم کی باریکیوں سے قطع نظر قاری زیادہ الجھاؤ کا شکار نہیں ہوتا۔ حقیقت پسند روایت کے فکشن کے ترجمے میں کبھی کبھار ہمیں اپنی مطلوبہ روانی اور سلاست مل جاتی۔ ان کے مقابلے میں اگر ہم بیسویں صدی کے اختتام اور اکیسویں صدی کے کچھ اعلی درجے کے تراجم کی بات کریں جیسے شاندور مارئی کا 'انگارے' (مترجم محمد عمر میمن) کالوس فئیونتیس کا 'ہالہ' (مترجم آصف فرخی) اور 'مجھے اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لو' (مترجم محمد عمر میمن) جوزف کانرڈ کا 'قلب ظلمات' (محمد سلیم الرحمان)۔ یہ ناول حقیقت پسند ناول کی سیدھی روایت سے ہٹے ہوئے ہیں۔ قلب ظلمات جیسے پیچیدہ اور گنجلک فن پارے کا ترجمہ اگر محمد سلیم الرحمان کی جگہ کوئی اور مترجم کرتا تو ممکن ہے وہ ضخامت میں ناول سے دوگنا ہو جاتا۔ ایسا ہونے کی صورت میں ترجمے میں وہ تخلیقی ابہام اور کثیر المعنیاتی خلا موجود نہ رہتا۔ یا دوسری صورت میں ترجمہ حوان رلفو کے ناول پیڈرو پرامو کا سا ہو جاتا۔ اس شاہکار ناول کا ترجمہ جدید غزل کے بہت اہم شاعر احمد مشتاق نے۔ ''بنجر میدان'' کے نام سے کیا ہے۔ لاطینی امریکی بوم کے ناولوں میں اس ناول کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ مارکیز کے 'تنہائی کے سو سال' پر اس کا اثر براہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مارکیز نے یہ عجیب و غریب ناول ایک ہی نشست میں دو بار پڑھ ڈالا تھا۔ ''بنجر میدان'' پڑھتے ہوئے قاری، مترجم کی مشقت اور جھنجھلاہٹ براہ راست محسوس کرتا ہے۔ ترجمہ بذات خود ایک صبر شکن کام ہے لیکن یہ خامی وہاں بنتا ہے جہاں ترجمے کے دوران مترجم کا الجھاؤ ناول کے بیانیے میں بھی در آئے۔ ''بنجر میدان'' اس کی بہترین مثال ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ناول کا اصل بیانیہ ہی اتنا طاقتور ہے کہ ترجمہ در ترجمہ کے باوجود قاری کو مسحور کر لیتا ہے۔ ذرا تصور کریں اگر یہ ناول خلاق ترجمہ نگاروں کے ہاتھوں ترجمہ نہ ہوتے

تو کیا صورت ہوتی ؟ان ناولوں کا بیانیہ پیچیدہ اور گنجلک ہے۔ایک ایک جملہ اپنے اندر معنی کا ایک جہان لیے ہوئے ہے۔ادب کا کوئی بھی قاری پہلی قرات میں ان ناولوں سے نہ لطف اندوز ہو سکتا ہے اور نہ ہی مکمل تفہیم کا دعوی کر سکتا ہے۔

دوسری طرف ہمارے ہاں حقیقت پسند ناولوں کے تراجم نے قارئین کا ایک وسیع حلقہ ضرور پیدا کیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اول درجے کی نہ سہی ہمارے پاس عالمی ناول کی حقیقت پسند روایت کے متوازی اپنی روایت بھی موجود ہے۔سو ہم ان ترجموں کا موازنہ اپنے تئیں مقامی ناول سے کر سکتے ہیں۔اسی موازنے سے یہ ناول کافی حد تک ہماری سمجھ میں بھی آجاتے ہیں۔لیکن جن ناولوں کا میں نے اوپر حوالہ دیا ہے اس سے ہمارے فکشن کی روایت نابلد ہے۔نابلد ان معنوں میں ہے کہ ہمارے ناول نگار اس روایت سے گہری شناسائی کے باجود اپنے ناولوں میں اس سے کام نہیں لے سکے۔پھر وہ قاری جو رواں اور سلیس نثر کا دلدادہ ہے وہ اور زیادہ مشکلات کا شکار ہو سکتا ہے۔ان ناولوں سے وہ قاری لطف اندوز نہیں ہو سکتا جو مغربی فکشن کی روایت سے انگریزی کی وساطت سے واقفیت نہیں رکھتا۔نہ ہی عام مترجم ان کا ترجمہ کر سکتے تھے۔محمد عمر میمن، محمد سلیم الرحمان، آصف فرخی اور اس قبیل کے دوسرے مترجمین کی مغربی فکشن کی روایت پر گہری نظر ہے۔

ہمارے یہاں مصیبت یہ ہے کہ ریاستی سطح پر ترجمے کا کوئی ادارہ نہیں ہے۔مغربی فکشن کے تراجم تو دور کی بات خود مقامی زبانوں کے تراجم کا کوئی قابل ذکر ادارہ نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ خود صوبوں کا آپس میں مکالمہ نہ ہونے کے برابر ہے۔مغرب میں فکشن کے منتخب تراجم نہیں ہوتے۔بڑے ناول نگاروں کا پورے کا پورا کام دوسری زبانوں میں ترجمے کے ذریعے پھیل جاتا ہے۔یوں مقامی فکشن نگار اور قارئین کو اس کے بارے میں مجموعی رائے قائم کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ہمارے یہاں شاید ہی کوئی مغربی ناول نگار ایسا ہو جس کا مکمل کام اردو میں ترجمہ ہوا ہو۔اس حوالے سے مترجمین کی اپنی مجبوریاں ہیں اور پھر اول درجے کے مترجم ہیں ہی کتنے۔ایسے میں قاری کے ساتھ ساتھ اردو کے نوجوان فکشن نگاروں پر بھی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ہمت کریں صرف ترجمے پر ہی انحصار نہ کریں تھوڑا آگے بڑھ کر انگریزی میں پڑھنے کی کوشش کریں۔ایسا کرنے سے وہ ترجمے کا معیار جانچنے کے قابل ہوں گے۔ہمارا فکشن نگار اس وقت تک اعلی درجے کی کہانی لکھ ہی نہیں پائے گا جب تک وہ اپنے کام کا موازنہ عالمی فکشن کے ساتھ نہیں کرے گا۔منٹو، بیدی، غلام عباس، انتظار حسین اور عینی کے فن کی صورت گری میں ان کے تراجم کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔وگرنہ وہی ہو گا کہ ہم ترجمہ کے ذریعے یا براہ راست انگریزی زبان کے راستے سے مغربی فکشن کا قاری ہونے کا دعوی کرتے رہیں گے لیکن جو کہانی ہم تخلیق کریں گے وہ خود ہماری زبان کی کہانیوں میں بھی تیسرے درجے ہی کی رہے گی۔

حوالہ جات وحواشی

1۔صفدر رشید، مرتبہ، فن ترجمہ کاری ،(اسلام آباد،پورب اکادمی،۲۰۱۵ء)ص ۴۳

2۔اجمل کمال، مرتبہ، گابرئیل گارشیامارکیز منتخب تحریریں(کراچی، سٹی پریس بک شاپ،۲۰۱۱ء)، ص ۴۱۰

"Many years later as he faced the firing squad,Colonel Aureliano Buendia was to remember that distant afternoon when his father took him to discover ice.At that time Mocondo was a village of twenty adobe houses,built on the bank of a river of clear water than ran along a bed of polished stone,which were white and enormous,like prehistoric eggs.The world was so recent that many things lacked names and in order to indicate them it was necessary to point.

Marquez,Gabriel Garcia,One Hunderd Years of Solitude,Avon Books,New York,1970,p.6

3۔ گیبریل گارشیامارکیز، تنہائی کے سو سال، مترجم ڈاکٹر نعیم کلاسرا(لاہور، فکشن ہاؤس،۲۰۰۰ء)ص ۱۳

4۔ شاندورمائی، انگارے، مترجم محمد عمر میمن، (کراچی، شہرزاد،۲۰۰۷ء)، ص ۷

5۔ شاندورمائی، انگارے، مترجم محمد عمر میمن (کراچی، شہرزاد،۲۰۰۷ء)، ص ۷۷

"The row of porclain candlesticks stands the length the table,holding thick,blue religious candles.The only other light comes from hidden points in the four corners of the room.The candles burn high with flickering light in the surrounding dimness.Logs glow darkly in the grey marble fireplace.The French doors stand open a little,the grey silk curtains are not quite closed,and the summer evening breezes come through the windows from time to time,while the thin curtains reveal the moonlit landscape and the glimmering lights of the little town in the distance."

نوٹ: یہ ناول Torrent سے ڈاؤن لوڈ کیا گیا ہے۔ اس پر سن اشاعت اور ادارے کا نام درج نہیں ہے لیکن یہ ترجمہ جین وے کا ہی ہے جس کا ذکر محمد عمر میمن نے انگارے کے دیباچہ میں کیا ہے۔

6۔میلان کنڈیرا، خندہ اور فراموشی کی کتاب، مترجم محمد عمر میمن، (کراچی، مکتبہ دانیال،۲۰۱۸ء)، ص ۶۱

"He had the impression this leap onto her body was a leap across an immense period of time,the leap of a little boy hurling himself from childhood to manhood.And then,while he was moving back and forth on her,he seemed incessantly to be describing the same

movement,from childhood to adulthood and then in reverse,and once again from the little boy miserably gazing at the gigantic body of a woman to the man clasping that body and taming it.That movement,usually measuring fifteen centimeters at most,was as long as three dacades".

Kundera,Milan,The Book of Laughter and Forgetting,Translated by Aaron Asher,Faber and Faber,London.1996.p.66

7۔ جوزف کونرڈ، قلب ظلمات، مترجم محمد سلیم الرحمان (کراچی، سٹی پریس بک شاپ، ۲۰۰۱)، ص ۱۷

"The sea-reach of the Thames stretched before us like the begining of an interminable waterway.In the offing the sea and the sky were welded together without a joint,and in the luminous space the tanned sails of the barges drifting up with the tide seems to stand still in red clusters of canvas sharply peaked,with gleams of varnished sprits.A haze rested on the low shores that ran out to sea in vanishing flatness.The air was dark above Gravesend,and father back still seemed condensed into a mournful gloom,brooding motionless over the biggest,and the greatest,town on earth".

Conrad,Joseph,Heart of Darkness,Dover Publications,New York,1990.p.1

8۔ محمد حسن عسکری، مجموعہ محمد حسن عسکری (لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰)، ص ۳۰۸